ڈاکٹر جمیل جالبی

شیخ ولی اللہ مُحبؔ: حالات و شاعری

Abstract: - *In this article a poet of 19th century Shaikh Waliullah Muhib has been introduced here who despite avails an importance stayed behind the common literary scene. In this article significance of his life and work has been presented. This article not only covers the poet but also unfolding the literary scenario of the time.*

انیسویں صدی کی روایت سخن کے ایک ممتاز شاعر شیخ ولی اللہ مُحبؔ (۱) (م ۱۲۰۷ھ؟ ۱۷۹۲/۳ء) ہیں۔ مُحبؔ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے (۲) اور حضرت شاہ افضل خدانما کی اولاد میں سے تھے (۳) جن کی وفات اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں ربیع الاول ۱۱۰۶ھ / نومبر ۱۶۹۴ء میں دہلی میں ہوئی (۴) ولی اللہ مُحبؔ خود نوکر پیشہ تھے (۵) جب دلی اجڑی تو مُحبؔ بھی تلاشِ معاش میں فرخ آباد چلے گئے اور مہربان خان رند کے ملازم ہو گئے۔ یہ وہی رند ہیں جو احمد خان بنگش کے دیوان تھے اور جن سے ایک عرصے تک سوداؔ و سوزؔ بھی وابستہ رہے۔ مُحبؔ کب فرخ آباد آئے اس کا پتا نہیں چلتا لیکن تاریخ اور تذکروں کا مطالعے سے قیام فرخ آباد کے دور کا قیاساً تعین کیا جا سکتا ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے کا پہلا مسودہ ۱۱۸۸ھ میں مکمل کیا۔ اس میں مُحبؔ کے فرخ آباد آنے اور مہربان خان رندؔ سے وابستہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے (۶)۔ لیکن جب ۱۱۹۱ھ میں نظر ثانی کے بعد اسے صاف اور مکمل کیا تو اس میں لکھا کہ: ''پیش مہرباں خان بہ طرف فرخ آباد بسر می برد'' (۷) اس سے معلوم ہوا کہ مُحبؔ دہلی سے ۱۱۸۸ھ کے بعد ۱۱۹۱ھ سے پہلے فرخ آباد آئے اور مہرباں خان رند سے وابستہ ہو گئے جس کا اظہار خود مُحبؔ نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے:

یارب رہے سلامت دنیا میں مہرباں خاں
ہر ملک ِ دل کی جس سے آباد بستیاں ہیں

اس کے بعد جو تذکرے لکھے گئے مثلاً تذکرہ مسرت افزا (۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء) گلشن سخن (۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء) ان میں مُحبّ کے مہرباں خاں رند سے توسل کا ذکر ملتا ہے۔ جب فرخ آباد کی بہار اُجڑی اور نجف خاں کی وفات (۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) کے کچھ عرصے بعد مہرباں خاں فرخ آباد سے لکھنؤ آ کر محلّہ رستم نگر میں آباد ہو گئے تو مُحبّ بھی بے آسرا ہو کر فرخ آباد سے اپنے وطن دہلی آ گئے "تذکرہ ہندی" میں مصحفی نے دہلی میں اُن سے اپنی کسی ملاقات کا کوئی ذکر نہیں کیا جس سے معلوم ہوا کہ مُحبّ مصحفی کے دہلی سے لکھنؤ آنے (۱۱۹۸ھ) کے بعد دہلی پہنچے۔ اس وقت شاہ عالم کی بادشاہی تھی اور شجاع الدولہ کے بیٹے مرزا میڈو سر سبز دہلی میں مقیم تھے۔ ثناءاللہ فراق، قدرت اللہ قاسم، مرزا عظیم بیگ عظیم اور انشاءاللہ خان انشا بھی دہلی میں تھے اور یہ سب مرزا میڈو کی محفل مشاعرہ میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں مُحبّ بھی ان مشاعروں میں نظر آتے ہیں (۸) ان مشاعروں میں ان کی حیثیت ایک بزرگ اور متین و بُرد بار انسان کی تھی۔ یہاں وہ انشا و عظیم کے معرکے میں دونوں فریقین کے درمیان صلح کراتے نظر آتے ہیں جیسا کہ قاسم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "شیخ ولی اللہ مُحب کے خداش بیا مرز دو ثالث بالخیر بود۔۔۔" (۹) شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ ابھی دہلی ہی میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہیں شہزادے سے راہ و رسم پیدا ہوئی اور ۱۲۰۵ھ میں وہ شہزادے کے ساتھ یا فوراً بعد لکھنؤ آ گئے۔ یہاں وہ استاد کی حیثیت سے صیغہ شاعری میں ملازم ہو کر شہزادے کی غزلیں بنانے پر مامور ہوئے۔ مصحفی نے "تذکرہ ہندی" میں لکھا ہے کہ "از چند سال بصیغہء شاعری در حضور مرشد زادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر امتیاز تمام داشت" (۱۰) شاہ کمال نے بھی یہی لکھا ہے کہ "استاد ہم در فن شاعری مرشد زادہ آفاق (مرزا سلیمان شکوہ) بود" (۱۱) لکھنؤ آ کر پیر کے ناسور کے مرض میں وفات پائی۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ "دو سال است کہ بہ مرض مزمن ناسورِ پا وداع جہانِ فانی کردہ۔۔۔" (۱۲) مصحفی کا تذکرہ ہندی ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوا۔ گویا مُحبّ نے ۱۲۰۷ھ میں وفات پائی۔ یہی سال وفات کریم الدین نے "تذکرۂ طبقات الشعرائے ہند" میں دیا ہے (۱۳) اور وہیں لکھنؤ میں شاہ عبدالجلیل کے احاطے میں مدفون ہوئے (۱۴)۔

بعض تذکرہ نویسوں نے جن میں میر حسن، عشقی اور شیفتہ شامل ہیں، مُحبّ کو سودا کا شاگرد لکھا ہے۔ مصحفی نے انھیں "متبع و ہم صحبت مرزا رفیع" لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ خود مُحبّ نے جن کیلئے سودا ایک مثالی شاعر کا درجہ

رکھتے ہیں اور جن کی شاعری پر سودا کے رنگِ سخن کا گہرا اثر ہے، اپنے ایک شعر میں اس بات کو صاف کر دیا ہے:

شاگرد گو نہیں ہوں یہ انداز گفتگو
فیضانِ نطق مجھ کو ہے مرزا رفیع کا

اب سوال یہ ہے کہ مُحبّ سودا کے ہم صحبت کہاں رہے؟ سودا دہلی میں تھے، پھر فرخ آباد، فیض آباد گئے اور پھر لکھنؤ آ گئے اور وہیں ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں وفات پائی۔ مُحبّ یا تو دہلی میں سودا کے ہم صحبت رہے جہاں سودا ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء تک مقیم رہے یا پھر وہ فرخ آباد میں مہرباں خان رند کے دورِ دیوانی میں سودا کے ہم صحبت رہے جہاں سودا ۱۱۷۶ھ سے ۱۱۸۳ھ یا ۱۱۸۵ھ تک مقیم رہے اور اس کے بعد وہ فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ (م ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء) سے وابستہ ہو گئے۔ زیادہ امکان دہلی میں ہم صحبت رہنے کا اس لیے ہے کہ ۱۱۸۴ھ/ تا ۱۱۸۸ھ میں لکھے جانے والے میر حسن کے "تذکرہ شعرائے ہندی" میں مُحبّ کے دہلی سے فرخ آباد آنے کا کوئی ذکر نہیں ہے (۱۵) فیض آباد میں خود میر حسن مرزا رفیع سودا سے بہت قریب تھے اور گاہ گاہ اپنی غزلوں پر اصلاح بھی لیتے تھے (۱۶) اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ مُحبّ نے سودا کی صحبت سے دہلی ہی میں فیض اُٹھایا اور وہ اثر قبول کیا کہ ساری عمر نہ صرف اس کا اعتراف کرتے رہے بلکہ سودا کے رنگ میں شاعری بھی کرتے رہے۔ دہلی میں سودا سے فیض صحبت اٹھانے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مُحبّ اپنے دوسرے معاصرین مثلاً ثناءاللہ فراق، مصحفی، انشاء، قدرت اللہ قاسم، عظیم بیگ عظیم وغیرہ سے عمر میں خاصے بڑے تھے اور یہی وجہ ہے کہ جب دہلی واپس آئے تو معرکہ انشاء و عظیم میں ان کی حیثیت "ثالث بالخیر" کی تھی۔

سودا کا ذکر مُحبّ نے متعدد اشعار میں کیا ہے جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر کہتے وقت سودا اور ان کی شاعری کا اثر ان پر غالب رہتا تھا:

تو نے سنی ہے مصرع سودا سے وہ مثل
آوازۂ دہل ہے خوش آیند دُور کا

ریختے کے ملک کا سودا کو بخشا حق نے راج
اس نگر میں کون ایسا ناظم و نا سق ہوا
مصرع سودا وردِ زباں کر روز و شب
کھول دو مشکل کشا عقدے مرے مشکل کے کل
ہجر میں اس کے مُحبّ حیف بقولِ سودا
ہوگئی جاری ہوا ایک نفس سرد کے ساتھ

ایک شعر میں سوؔدا کی وفات اور میرؔ کے کلکتہ جانے کی طرف اشارہ ملتا ہے:

سودا تو ارم کو ہوئے رخصت یہ غزل سُن
کلکتے کو ہوں لکھنؤاؤ سے میرؔ مرخّص

مُحبّ کے دیوان کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انشاؔ و عظیمؔ کے معرکے میں وہ عظیمؔ کے ساتھ تھے۔ ''ساتوں'' ردیف والی غزل جس کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے اور جس زمین میں انشا کی ''پانچوں'' ردیف والی غزل کے جواب میں عظیمؔ کے حامی شاعروں نے غزلیں کہی تھیں مُحبّ کی غزل بھی ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

گزرے ہیں دو مہینے دن جس کے بار ساتھوں
تھے تیرے دردو غم میں کیا غمگسار ساتھوں

اسی طرح انشاؔ کی قطعہ نما غزل کا وہ شعر پڑھیے جس میں حکیم ثنا اللہ فراق اور حکیم قدرت اللہ قاسم کی طرف اشارہ کیا ہے: ہوں وہ جبروتی کہ گروہِ حُکما سب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے

اور پھر مُحبّ کی وہ پندرہ شعر پر مشتمل قطعہ نما غزل پڑھیے جو اُن کے دیوان میں ملتی ہے اور جس کے یہ شعر انشاؔ و عظیمؔ کے اس قضیہ کو چُکانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں تا کہ نواب مرزا میڈو بیچ میں پڑ کر اس معاملے کو رفع دفع کرادیں:

مبحث میں چکے چاہیے قضیہ شعرا کا
اس فن کے کسی صاحبِ توقیر کے آگے
ہے نقص جو شاعر ہوئے فریادی و دادی
اکبر کے حضور اور جہانگیر کے آگے
نیزے پہ ہدف کر کے رکھیں ہم سرِ حاسد
تیرِ قلم اپنے کے سرِ تیر کے آگے
ہو رستم میدان سخن کے بھی ہمارا
یک مصرع سو مصرع شمشیر کے آگے
جو عرض و مطالب کرے مقصد ہی کو پہنچے
باصدق مُحبّ حضرت شبیر کے آگے

اور پھر یہی ہوا جیسا کہ قدرت اللہ قاسم نے بھی لکھا ہے کہ:

''۔۔۔۔نواب کامیاب بزرگی را کار بستہ بایں صاحبان و مُحبّ مہربان از جائے خود جستہ بجائے ماہا رسیدہ دلجو یہا فرمود ایں بزرگاں خصوصاً میر معزالیہ (انشا) کار بست بزرگی گشتہ بزرگی بزرگاں پیش آمدہ بسینہ ہر یک چیدہ داد بزرگ منشی و خوش خُلقی دادہ..........''(۱۷)

اور یہ جھگڑا ہجویات کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔

ولی اللہ مُحبّ ''مؤدب، متواضع و خلیق''(۱۸) انسان تھے۔ اچھے لوگوں کی صحبت اُٹھائی تھی۔

آدابِ محفل سے واقف تھے۔صاحب دیوان شاعر تھے۔اس دور کے ممتاز شعرا میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔اُن کا قلمی دیوان انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے جسکا اب تک کوئی دوسرا نسخہ دریافت نہیں ہوا(۱۹)۔اس میں ایک ''مستزاد'' اور ایک ''مخمس'' کے علاوہ باقی سب غزلیات ہیں۔غزلوں میں بعض قطعہ بند اور بعض مسلسل ہیں سارا کلام سنجیدہ اور ہجو و مدح سے پاک ہے۔یہی مُحبؔ کا معیارِ شاعری ہے:

ہے یہ شاعر کو سلامت روی استغنا
نہ کہے ہجو کسی کی نہ کسی کا اوصاف

مُحبؔ کہنہ مشق شاعر ضرور ہیں اور ان کی شاعری عشقیہ شاعری بھی ہے لیکن بنیادی طور پر اُن کا میلانِ طبع مضمون آفرینی کی طرف ہے:

مُحبؔ جوں آب گوہر بحر میں اشعار کے ہم کو
بہ ہر صورت ابھی ہے معنی تہ دار کی خواہش

معنی کی تلاش میں اُن کی شاعری جذبہ و احساس سے اس حد تک عاری ہو جاتی ہے کہ ان کے اشعار عام طور پر قاری کے دل و دماغ کو نہیں پکڑتے۔جذبے کی کمی اُن کی شاعری سے جہاں اثر پزیری کو کم کر دیتی ہے وہاں شعر میں لفظوں کی ترتیب سے وہ قوت بھی پیدا نہیں ہوتی جو شعر میں جان ڈالتی ہے۔مُحبؔ کی شاعری میں اسی وجہ سے ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔اُن کا شعر ایک پوری اکائی نہیں بن پاتا۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ بات ادھوری رہ گئی ہے اور شاید اب اگلے شعر میں مکمل کی جائے گی۔جذبات کی زیادتی اور شدت جہاں شاعری کو بے اثر کر دیتی ہے وہاں جذبات کی کمی بھی اُسے کمزور کر دیتی ہے۔اچھی شاعری حسب ضرورت جذبے کے اعتدال سے پیدا ہوتی ہے اور یہ اعتدال مُحبؔ کی شاعری میں عام طور پر نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ مُحبؔ کے کلام میں وہ روانی و شگفتگی، وہ انداز و آہنگ بھی نہیں ہے جو ثنا اللہ فراق کے کلام میں ملتا ہے۔ مثلاً مُحبؔ کے یہ چند شعر پڑھیے تا کہ وہ بات جو ہم نے کہی ہے اس کی وضاحت ہو سکے:

ے درد اُس بے درد کے آگے کہا جاتا نہیں
بن کہے بھی سخت مشکل ہے رہا جاتا نہیں

ے ہم اپنے دل کی حالت کیا کہیں بن موت مرتے ہیں
تجھے ٹک دیکھ لیتے ہیں تو گویا جان پاتے ہیں

ے یوں نوکِ ہر مژہ پہ نمایاں ہے لختِ دل
جس طرح شاخ گل سے رہی ہو کلی نکل

ے ہجر میں کہتے ہیں سُن نالہ مرا ہمسائے
کوئی روتا ہے دل آزردہ عجب درد کے ساتھ

ے نہ کچھ اسباب جینے کا نہ کچھ اسلوب مرنے کا
مرے بیتاب رہنے کا سبب تیرا تغافل ہے

یہ اچھے خاصے شعر ہیں لیکن ان اشعار کو پڑھ کر اُس کے باوجود کہ بات کا ایک پہلو اُن میں موجود ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا دل ان میں شامل نہیں ہے مثلاً تیسرے شعر میں پلکوں پر آنے والے آنسوؤں کو شاخِ گل سے نکلتی ہوئی کلی سے تشبیہ دی ہے، معنی کے اعتبار سے یہ شعر اچھا ہے لیکن اچھا ہونے کے باوجود یہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر نہیں چھاتا۔پہلے مصرع میں غم واندوہ کی وجہ سے آنسو پلک پر آئے ہیں اور شاعر نے غم کا اظہار کیا ہے۔دوسرے مصرع میں شاخِ گل سے کلی کا نکلنا ایک انبساط کی کیفیت کو سامنے لاتا ہے جو پہلی کیفیت یعنی اظہارِ غم سے مختلف و متضاد ہے۔غم کا اظہار جب انبساط کی کیفیت کو اُبھارے تو ظاہر ہے کہ غم کے اظہار کا وہ اثر نہیں ہوگا جو شاعر کا مقصد ہے، اس لیے یہ شعر اچھا ہوتا ہوئے بھی بے اثر ہے، باقی اور دوسرے اشعار کو بھی دیکھیے ان میں جذبہ شامل نہ ہونے کی وجہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری بات بناوٹی ہے، جیسے چھوٹے منہ بات کہی جا رہی ہو اور اس لیے قاری اس پر یقین نہیں کرتا اور شعر بے اثر ہو جاتا ہے۔

جذبے سے الگ رہ کر مضمون آفرینی اس دور کا وہ رجحان ہے جو بیک وقت دہلی اور لکھنؤ دونوں

مراکز ادب میں تیزی سے نمایاں و مقبول ہو رہا ہے۔ ایک طرف زوال پذیر و شکست خوردہ تہذیب نے "معنی" گم کر دیئے ہیں اور دوسری طرف تخلیقی ذہن نئے معنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اس دور میں ادب کی نئی تحریک اور نیا رجحان اسی سمت میں سفر کر رہے ہیں۔ مُحبؔ کے ہاں بھی مضمون آفرینی کا رجحان، اثر سودا کے ساتھ، تلاش معنی کے اُسی رُخ پر جا رہا ہے۔ یہ چند شعر دیکھئے:

؎ پیارے مجھے تیرا یہ تصور ہے رات دن
جاتا رہا خیال بھی آنکھوں سے خواب کا

؎ ان دو کے سوا کو ئی فلک سے نہ ہوا یار
یا تیر میری آہ کا یا اُس کی نظر کا

؎ جس طرح ہر شجر کو پانی سے تازگی ہے
یوں نخل مدعا کو دے برگ و بار رونا

؎ محبت سے طریقِ دوستی سے چاہ سے مانگو
مرے صاحب کسی سے دل جو مانگو راہ سے مانگو

؎ مذہبِ عشق کے عُشاق جو ہم مشرب ہیں
وہ نہ کافر ہی ہوئے اور نہ مسلمان ہوئے

تلاشِ معنی کا یہ وہ رجحان ہے جو ایک طرف مُحبؔ کے ہاں اور دوسری طرف لکھنؤ میں امام بخش ناسخ، طالب علی عیشؔ، رائے جسونت سنگھ پروانہ اور بیرونِ لکھنؤ قاضی محمد صادق خاں اختر اور مہدی علی خان زکی مرادآبادی کے ہاں، بھی طلوعِ آفتاب کی طرح ہولے ہولے نمایاں ہو رہا ہے۔

مُحبؔ نے ہر قسم کی غزلیں کہی ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں جو غزلیں کہی ہیں وہ عام طور پر زمین سے ایک جان ہوگئی ہیں۔ دہلوی رنگ سخن کا یہ عام مزاج ہے۔ لکھنؤ میں زور زمین پر رہتا ہے اور اسے اس طرح نمایاں کیا جاتا ہے کہ شاعر کی اُستادی و قادرالکلامی کی دھاک بیٹھے اور اہلِ محفل داد کے ڈونگرے برسائیں۔ دہلی

میں یہ عیب سُخن ہے کہ زمین اپنے وجود یا اپنے مشکل ہونے کا احساس دلائے۔ اس دور میں دہلی میں بھی طویل غزلیں کہنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا یہ رجحان فراقؔ کی طرح بلکہ اس سے زیادہ مُحبؔ کے ہاں ملتا ہے۔

مُحبؔ کی قصیدہ طور غزلوں میں اشعار کی تعداد گیارہ سے لے کر پندرہ، سترہ، اٹھارہ، بیس اور بائیس تک ہے۔ ان کے ہاں غزل در غزل بھی ملتی ہے۔ دو غزلہ بھی ملتے ہیں اور کچھ سہ غزلہ بھی ہیں۔

اگر اس دور کی دہلوی شاعری کا مقابلہ لکھنؤی شاعری سے کریں تو محسوس ہوگا کہ دہلوی شاعری میں سنجیدگی ہے۔ لکھنوی شاعری میں شوخی ہے۔ دہلی میں تصوف جانِ شاعری ہے۔ لکھنؤ میں شاعری تصوف سے کم و بیش عاری ہے۔ دہلی میں عشق کا وہی طور ہے جو مظہر جانجاں، شاہ حاتم، یقین، تاباں، میر، سودا اور درد سے عام ہوا۔ لکھنؤ میں عشق معاملہ بندی ہے جس میں عاشق کی نظر محبوب کے جسم پر ہے اس لیے سراپا لکھنؤ کا مقبول موضوع سخن ہے۔ دہلی میں احساسِ ہجر ہے۔ لکھنؤ میں احساسِ وصل ہے۔ دہلی میں عشق کی نوعیت "حقیقی" کی طرف لے جاتی ہے۔ لکھنؤ میں یہ خالص "مجازی" ہے۔ دہلی کی شاعری عشق کی شاعری ہے۔ لکھنؤ کی شاعری معشوق کی شاعری ہے۔ دہلی کی زبان پر قدیم اثرات موجود ہیں، لکھنؤ میں یہ اثرات بالکل کم یا غائب ہوگئے ہیں۔ مُحبؔ ان دونوں اثرات کی چکی میں پس کر رہ جاتے ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بس روایت کی تکرار کے شاعر ہیں اور اسی لئے ان کے ہاں گفتگو میں کوئی "انداز" پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا کلام پڑھ کر طرزِ احساس کی تبدیلی کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور یہی وہ کام ہے جو صفِ دوم کے شعرا کرتے ہیں۔

جہاں تک مُحبؔ کی زبان کا تعلق ہے وہ دہلی کی زبان لکھتے ہیں اور جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں، دہلی کی زبان پر قدیم اثرات ابھی باقی ہیں اور وہ عام بول چال کی زبان کا حصہ ہیں۔ یہ وہی اثرات ہیں جو شاذ اللہ فراق کے ہاں بھی ملتے ہیں مُحبؔ کے ہاں ان کی نوعیت و صورت یہ ہے:

کبھو:	ع	بے زر نہ ہنبھے عشق کبھو سیم براں کا
وو	ع	رات قصداً وو میرے ساتھ نہ آسو یا تھا

کسو،ٹک: ع کسو نے ٹک جولیا نام اُس ستم گر کا

تجہ چشم: ع بیمار کا تجہ چشم کی دیکھا عجب احوال

ہم پاس: ع ہم پاس اب خدا کا فقط نام رہ گیا

ہوجو: ع یہ سُن رکھو مُحبّ تم عاشق نہ کھبو ہوجو

جُدی: ع ہے عشق کی منزل کی جُدی راہ جُدی باٹ

کردے ہے: ع خفا کردے ہے بے صبری سے اپنے یار کو یہ دل

ندان: ع یہ سیہ روندان ہے تیرا

اس طرح سنمکھ ۔تو ولیکن ۔سریجن ۔آئیاں ۔اچپلائیاں وغیرہ الفاظ ملتے ہیں۔مُحبّ کے ہاں یہ اثرات کم ضرور ہوئے ہیں لیکن پوری طرح متروک نہیں ہوئے جبکہ لکھنؤ کے شعرا نے ان الفاظ کے استعمال کو کم وبیش ترک کر دیا ہے۔اس طرح ''ہ۔ھ'' کا استعمال جو عام طور پر بعض الفاظ سے خارج ہو گیا تھا مُحبّ کے ہاں اب بھی ملتا ہے شہزادہ سلیمان شکوہ کے ہاں بھی اسکا استعمال ملتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ قلعۂ معلّٰی کی زبان میں یہ اثر اب بھی موجود تھا مثلاً محبّ کے ہاں "ہ۔ھ" کے استعمال کی یہ صورت ملتی ہے:

خاکھ (خاک) ع توہوا پنا گرائیں جس خاکھ

ہونٹھ (ہونٹ) ع ہونٹھ پر اس گُل کے بُت خالے بڑے

بگھولا (بگولا) ع بگھولا نہ دامانِ صحرا تک آوے

محبّ بعض الفاظ اُسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح وہ بولے جارہے ہیں حالانکہ قواعد کی رو سے وہ غلط ہیں جیسے لب سے ''مُلبّب'' یعنی لبالب بھرا ہوا: ع کہ صبح آگے دھرا مُلبب نہ خونِ دل سے ایاغ اپنا۔اسی طرح بعض تاریخی شخصیات سے منسوب صفات سے وہ نام کو صفت کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس کی جمع بھی بنا دیتے ہیں جیسے:

روز و شب آنکھوں نے کیں گریہ سے وہ یعقوبیاں

یہ گئیں سب دل سے باتیں صبر کی ایوبیاں

مُحبّ کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کی زبان پر اٹھارہویں صدی کی زبان کے اثرات، لکھنؤ کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے اور خود قلعہ معلّٰی کی زبان پر یہ اثرات اور بھی زیادہ تھے جس کی تصدیق شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے اردو دیوان سے بھی ہوتی ہے۔مرزا سلیمان شکوہ شاعری میں ولی اللہ مُحبّ ہی کے شاگرد تھے۔

حوالہ جات:

۱،۲۔ تذکرہ شعرائے اُردو، میر حسن، مرتبہ محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، ص۱۵۹، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۰ء

۳۔ مجموعہ نغز (جلد دوم) قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی، ص۱۶۴، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ء

۴۔ شاہ افضل خدانی کا مزار ''مقابل محل بھولی بھٹیارن (بوعلی بختیاری) اور بقول صاحب آثار الصنادید (سرسید احمد خان) بولا خان پٹھان کی جانب شمال ایک چار دیواری میں ہے'' مزارات اولیاء دہلی، محمد عالم شاہ فریدی دہلوی، ص۱۱۸ (باردوم)، جید برقی پریس دہلی ۱۳۴۶ھ۔

۵۔ تذکرۂ شعرائے اردو، محولہ بالا، ص۱۵۹

۶۔ تذکرہ شعرائے ہندی، میر حسن، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، لکھنؤ ۱۹۷۹ء

۷۔ تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن، محولہ بالا، ص۱۵۹

۸۔ مجموعہ نغز محولہ بالا جلد اول، ص۸۳-۸۴

۹۔ مجموعہ نغز جلد اول، محولہ بالا ص۸۴

۱۰۔ تذکرہ ہندی، مصحفی، محولہ بالا، ص۲۳۱

۱۱۔ مجمع الانتخاب، شاہ کمال، ص۱۳۰

۱۲۔ تذکرہ ہندی، محولہ بالا ص۲۳۱

۱۳۔ طبقات اشعرائے ہند، فیض و کریم الدین، ص ۳۴۸، دہلی ۱۸۴۸ء

۱۴۔ تذکرہ ہندی، محولہ بالا ایضاً اور مجمع الانتخاب (تین تذکرے، ص ۱۳۰)

۱۵۔ تذکرہ شعرائے ہندی، مکتوبہ بخط میر حسن ۱۱۸۸ھ، مرتبہ اکبر حیدری کاشمیری، لکھنو ۱۹۷۹ء

۱۶۔ تذکرہ شعرائے ہندی محولہ بالا ص ۱۷۲

۱۷۔ مجموعہ نغز، قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی، ص ۸۵، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳

۱۸۔ عمدۂ منتخبہ، نواب اعظم الدولہ سرور، ص ۶۷۳، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۶۱

۱۹۔ انجمن ترقی اردو کے نسخے کی نقل کے لئے میں مشفق خواجہ صاحب کا شکر گزار ہوں۔ (ج۔ج)

☆☆☆